بحث ونظر

شہریت پسندی کا رجحان اور اسلام

(۲)

مولانا سلطان احمد اصلاحی

دیہات پر شہر کی فضیلت کے بعض دوسرے دلائل

شہری اور دیہاتی کی اس بحث میں بعض دوسرے دلائل بھی دیے گئے ہیں جن سے بالواسطہ دیہات پر شہر کی فضیلت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس موقع پر ان دلائل کا جائزہ لینا اور ان پر تحقیق کی نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔

بعثتِ انبیاءؑ

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات کہی گئی ہے کہ دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جو نبی اور رسول بھی بھیجے گئے، ان سب کا تعلق شہری آبادی 'قریٰ' سے تھا، دیہاتیوں اور بادیہ نشینوں، اہل البوادی، میں چونکہ مزاج کی سختی اور طبیعت کا کھردرا پن نمایاں تھا، اس لیے ان کے درمیان سے تاریخ کے کسی عرصہ میں کوئی رسول نہیں بھیجا گیا۔ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تو دنیا کے تمام شہروں کے مرکز اتصال 'ام القریٰ' مکہ سے تھا ہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جو رسول دنیا میں آئے، ان سب کا تعلق بھی شہر 'قری' سے ہی تھا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا	اور (اے نبیؐ) آپ سے پہلے ہم نے جو
رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ	رسول بھیجے وہ مرد ہی تھے جن تک ہم اپنی وحی
الْقُرٰى (یوسف: ۱۰۹)[1]	کرتے تھے۔ یہ شہر کے لوگ تھے۔

اس موقع پر بلاشبہ 'قریہ' کی جمع 'قریٰ' سے مراد شہر 'مدینہ' ہے[2] لیکن آیت کریمہ سے یہ

---

[1] دیکھیے: تفسیر ابن کثیر: ۳۸۳/۲، مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء

[2] الراغب الاصفہانی م ۵۰۲ھ مفردات القرآن ۴۱۲/۱، مطبعۃ میمنیہ، مصر ۱۳۲۶ھ۔

استدلال پوری طرح کفایت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہی قرآن کی دوسرے موقع پر صراحت ہے کہ:

وان من امۃ الا خلا فیہا	اور جو بھی امت رہی ہے اس میں کوئی نہ کوئی
نذیر (فاطر: ۲۴)	ڈرانے والا ضرور رہا ہے۔

جبکہ 'امت' کے معنی امام راغب اصفہانی م ۵۰۲ھ یہ بتاتے ہیں:

الامۃ کل جماعۃ یجمعہم	امت ہر وہ جماعت ہے جس کے درمیان
امر ما اما دین واحد او زمان	کوئی ایک چیز قدر مشترک ہو، ایک دین ہو،
واحد او مکان واحد[1]	ایک زمانہ ہو یا ایک جگہ ہو۔

اس لحاظ سے جگہ کی یکجائی سے اگر شہر والے ایک 'امت' ہیں تو اسی یکجائی سے دیہات والوں کو بھی ایک 'امت' ماننا ضروری ہے۔ پس اگر ہر امت میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا اللہ کا نبی اور رسول ضرور رہا ہے، تو شہری امت کے ساتھ دیہاتی امت کو اس میں شامل کیے بغیر چارہ نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی سرگزشت کے کتاب اللہ کے حوالہ سے یہ نکتہ مزید موکد ہو جاتا ہے۔ جس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ان کی بود و باش بجائے شہر کے دیہات میں تھی اور وہ اسی دیہات سے اٹھ کر اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ سے ملنے کے لیے مصر آئے تھے۔ سخت ترین حالات میں اپنے باپ سے طویل عرصہ کی جدائی کے بعد خانوادے کے دیگر افراد کے ساتھ ملاقات کے موقع پر اپنے رب کے دیگر احسانات کے تذکرہ کے ساتھ ایک بات وہ یہی فرماتے ہیں:

وجاء بکم من البدو (یوسف: ۱۰۰)	اور تمہیں گاؤں دیہات سے لے آیا۔

جس کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی م ۱۲۳۰ھ گاؤں[2] اور مولانا امین احسن اصلاحی 'دیہات'[3] سے کرتے ہیں اور تاریخ و آثار سے اسی ترجمہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ معلوم ہے کہ

---

[1] مفردات ۱/۲۱، محولہ صدر

[2] موضح القرآن ۲/۴۰۶، تاج کمپنی لاہور۔

[3] تدبر قرآن: ۳/۲۸۱۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء۔

مصر سے اسّی فرسخ کے فاصلہ پر واقع شام و فلسطین کی سرزمین 'کنعان'[۱]، حضرت یعقوب کا مسکن اور ان کی جائے قیام تھی۔ اپنے خانوادے کے ستر افراد کے ساتھ یہیں سے چل کر وہ اپنے صاحبزادے سے ملنے کے لیے مصر آئے تھے۔ یہ بیان تو ہمارے اسلامی مآخذ کا ہے۔ عہد نامۂ قدیم میں صراحت ہے کہ 'ملک کنعان میں حضرت یعقوب کا قیام اس کے شہر 'سکم' میں نہیں بلکہ اس کے نزدیک اور سامنے تھا'[۲]۔ دوسری جگہ ان کی قیام گاہ کی شہر مذکور سے فاصلہ کی مزید صراحت ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ کے بیان میں ہے کہ 'اس کے بھائی اپنے باپ کی بھیڑ بکریاں چرانے سکم کو گئے'[۳]۔ اس سلسلۂ بیان میں دوسرے اشارات اور تصریحات بھی ہیں جن سے حضرت یعقوب کی رہائش کے شہر سے دور ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور سیدنا اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے جیسے عظیم المرتبت پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کی رہائش اور ان کی دعوت کا مرکز جب شہر کے بجائے دیہات ٹھہرا، تو اس کی روشنی میں پہلی آیت کریمہ (یوسف: ۱۰۹) جس میں اللہ کے رسولوں کی شہر میں بعثت کا تذکرہ ہے، اس کی توجیہ کی ضرورت ہے۔ اب یا تو یہ کہا جائے کہ عرب کی شہر مرکوز آبادی کی مناسبت سے یہ بات کہی گئی، جہاں اس سے ہٹی ہوئی دیہات کی آبادی اُس وقت کے حالات میں اپنی لازمی کمیوں کے باعث ایک طرح سے ثانوی درجے کی حامل ہو کر اس عظیم منصب کے لیے کم اہل رہی۔ یہ بات خاص کتاب اللہ کے اولین مخاطبین کی رعایت سے تھی جس سے اس کی سے دور ترقی یافتہ

---

[۱] ابن جریر طبری م ۳۱۰ھ: تاریخ الرسل والملوک المعروف بتاریخ الطبری: ۱/۳۴۸، دار المعارف مصر، طبع جدید ابن اثیر جزری م ۶۳۰ھ: الکامل فی التاریخ: ۱/۸۴، ۸۷۔ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء طبعہ سادسہ۔ محقق ایڈیشن۔ [۲] طبری: ۱/۳۶۴، عہد نامۂ قدیم کے مطابق ارض کنعان سے آنے والی یہ تعداد چھیاسٹھ بعد میں خانوادۂ یوسف کی شمولیت سے یہ ستر ہوئی۔ کتاب پیدائش: باب: ۴۶: آیت: ۲۶-۲۷، بنگلور ۱۹۸۵ء بائبل سوسائٹی ہند۔ [۳] الفاظ ہیں: اور یعقوب جب فدان ارام سے چلا تو ملک کنعان کے ایک شہر 'سکم' کے نزدیک صحیح سلامت پہنچا اور اس شہر کے سامنے اپنے ڈیرے لگائے۔ کتاب پیدائش: باب: ۳۳: آیت: ۱۸، محولہ بالا۔ [۴] کتاب پیدائش: باب: ۳۷: آیت: ۱۲، محولہ صدر۔ اگلی آیت: ۱۳ ہے: 'تب اسرائیل نے یوسف سے کہا تیرے بھائی سکم میں بھیڑ بکریوں کو چرا رہے ہوں گے۔

دیہی آبادی کا استثناء اپنے آپ میں ظاہر ہے۔ دوسری آیت کریمہ (فاطر: ۲۴) میں 'امت' کا عموم اسی کمی کی تلافی کرتا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ بات تمدنی ارتقاء کے پچھلے دور کے لیے خاص تھی۔ جس میں بوجوہ اس کی رفتار بہت مدھم ومحدود ہوکر اکثر وبیشتر دور افتادہ دیہات کی آبادی اس سے بے فیض رہ جاتی تھی۔ جس کا ایک اثر مزاج کی سختی اور اس کی طبیعت کے کھردرے پن کی صورت میں نمایاں ہوتا تھا اور تربیت واصلاح کے مواقع کی کمی سے اس کی تلافی کا سامان بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ اب جبکہ سائنس وٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور ذرائع آمدورفت اور وسائل ابلاغ کی فراوانی سے دیہاتوں کو شہروں سے جوڑنا آسان اور ان کو ان کی ترقیات سے فیض یاب کرنا ممکن الحصول ہوگیا ہے جس کے نتیجے میں تربیت واصلاح کی مہم چلاکر دیہی آبادی کے روایتی اجڈپن اور گنوارپن کو دور کرنا دشوار نہیں رہ گیا ہے، تو حالات کی تبدیلی سے فرق وامتیاز کے اس فاصلے کا کم ہوجانا بھی فطری ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نبوت ورسالت کا سلسلہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا تو اس کی اساس پر قائم اس بحث کے زور کا اپنے آپ کم ہوجانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ عدم قبول ہدیہ

اسی موقع پر اس بحث کا دوسرا نکتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل اور اس ارشاد کے حوالہ سے اٹھایا گیا ہے کہ 'میں عرب کے بدوؤں' اعراب' سے اب کوئی ہدیہ قبول نہیں کروں گا، صرف اس کی شہری آبادی کے مخصوص قبائل ہی سے ہدیہ قبول کروں گا'[1] جامع ترمذی کی اس

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۸۳۔ جامع ترمذی کی اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے اس موقع پر خلاف معمول حوالہ کے بغیر نقل کیا ہے۔ جس کی زحمت سے بچنے کے لیے جناب صابونی صاحب نے اس کے اپنے اختصار میں اس روایت کو ہی صاف کردیا ہے۔ مختصر تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۶۵، دارالقرآن بیروت ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء، طبعہ سادسہ۔ جو جناب صابونی کی طرح زیادتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر کی اصل ضرورت اختصار کے بجائے اس کے حوالوں کی تحقیق اور روایات کی تخریج تھی۔ جس کے سلسلے میں جناب صابونی نے حد درجہ سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ اکثر وبیشتر متن میں مراجع حدیث کا جو سادہ تذکرہ تھا، حاشیہ میں انھوں نے اسی کو ابھار کر لکھ دیا ہے۔ احادیث وآثار کا مکمل حوالہ فراہم کرنے کی کہیں زحمت نہیں کی ہے جس کی وجہ سے اکثر وبیشتر یہ تخریج کسی افادیت سے خالی ہے۔ تفسیر کے اختصار کا جو کام کیا ہے =

روایت کے مطابق ایک عرب دیہاتی 'اعرابی' نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک جوان اونٹنی (بکرہ) کو ہدیہ میں پیش کیا جس کے بدلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی ہی چھ اونٹنیاں دیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تشفی نہیں ہوئی اور وہ اس پر اپنی ناراضگی کو ظاہر کرتا پھرا۔ آپؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حسب روایت آپؐ نے بروقت ایک خطبہ دیا۔ حمد و ثناء کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ان فلانا اهدی الیّ	فلاں شخص نے تحفے میں مجھ کو ایک عمر رسیدہ
ناقة فعوضته منها ست بكرات	اونٹنی دی جس کے بدلے میں میں نے اسے
فظل ساخطا	چھ جوان اونٹنیاں دیں، اس کے باوجود بھی
	وہ ناراض رہا۔

اس کے بعد کا ٹکڑا ہے اور وہی اصل دلچسپی کا ہے:

لقد هممت ان لا اقبل	میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ اب
هدية الا من قرشي او انصاري	میں کسی قریشی، انصاری، ثقفی یا دوسی کا ہی
او ثقفي او دوسي[1]	ہدیہ قبول کروں گا۔

اس روایت سے بھی ایک طرح سے دیہات پر شہر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ نے دیہاتیوں کے ہدیہ کو رد کرتے ہوئے صرف شہریوں کے ہدیہ کو قبول کرنے کی بات کہی۔ لیکن بعثت انبیاءؑ سے متعلق آیت بالا کی طرح اس استدلال کے لیے یہ بھی کفایت نہیں کرتی۔ اس لیے کہ اس کے حوالہ سے آپؐ کا مقصود اگر دیہاتی کے مقابلے شہری کی فضیلت کا بیان ہوتا تو چند مخصوص قبائل کا نام لینے کے بجائے آپؐ سیدھے سیدھے 'اہل مکہ' یا 'اہل مدینہ' یا صاف صاف یہ کہتے کہ 'تحفہ میں میں کوئی چیز صرف شہر والوں سے ہی قبول کروں گا، دیہاتیوں اور بدوؤں سے کوئی چیز قبول نہیں کروں گا'۔ اس لیے کہ مدینہ میں صرف قریشی، انصاری، ثقفی اور دوسی ہی لوگ نہیں تھے۔ بلکہ ان کے علاوہ دیگر قبائل کے لوگ بھی اس

= دراصل اس کو 'مثلہٗ' کہنا زیادہ مناسب ہے۔ تفسیر ابن کثیر کسی اختصار کی متحمل نہیں اور علماء محققین کو اصل کی مراجعت کے بغیر اس کے اختصار پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

[1] جامع ترمذی جلد ۲۔ ابواب المناقب، باب ثقیف وبنی حنیفہ۔ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

شہر میں آباد تھے۔ مزید اس میں حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت صہیب رومیؓ جیسے صحابہ بھی تھے جن کا سرزمین عرب سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ان قبائل کی نشاندہی کا یہ منشا کوئی قبول نہیں کرسکتا کہ غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہمارے ان بزرگوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کوئی ہدیہ قبول نہ کرتے۔ پس یہ روایت دیہاتی پر شہری کی فضیلت کے بیان سے متعلق نہیں، اس میں صرف مذکورہ قبائل کی اعلیٰ ظرفی اور ان کی بلند طبعی کی تعریف ہے۔ سادہ لفظوں میں آپؐ یہ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ میرے لیے صرف اعلیٰ ظرف اور بلند طبیعت لوگوں کا ہی ہدیہ قابل قبول ہوگا۔ کم ظرف اور پست طبیعت لوگوں کی کوئی چیز میرے لیے بطور تحفہ قبول کرنا بہت دشوار ہوگا۔ روایت کے دوسرے طریقے سے یہ نکتہ صاف ہوجاتا ہے۔ جس میں مذکور قبائل کے علاوہ شہر اور دیہات کی کسی تفریق کے بغیر مطلق کسی عرب سے ہدیہ نہ قبول کرنے کی صراحت ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے آپؐ نے برسرِ منبر ارشاد فرمایا:

ان رجالا من العرب	عرب کے کچھ لوگ ہیں جن میں سے ایک
یهدی احدهم الهدیة	شخص ہدیہ میں کوئی چیز دیتا ہے تو اس کے بدلے
فاعوضه منها بقدر ما	میں میرے پاس جس قدر ہوتا ہے میں اسے
عندی ثم تیسخطه	واپس کرتا ہوں۔ لیکن وہ ہے کہ اس پر
فیظل یتسخط فیه علی	ناراضگی ظاہر کرتا ہے اور اس کے حوالہ سے
وایم الله لا اقبل بعد	مجھ پر برابر ناراض رہتا ہے۔ قسم اللہ کی اس
مقامی هذا من رجل	جگہ کے بعد میں عرب کے کسی آدمی کی طرف
من العرب هدیة الا من	سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔ سوائے
قرشی او انصاری او ثقفی	اس کے کہ وہ قریشی، انصاری ثقفی یا دوسی
او دوسی [1]	ہو تو اس کی بات الگ ہے۔

اس لحاظ سے حافظ ابن کثیر نے حدیث بالا کی جو یہ تعلیل کی ہے وہ پوری طرح

---

[1] ترمذی، حوالہ سابق۔ خیال رہے کہ امام ترمذی نے اوپر کی یزید بن ہارون کی روایت کے مقابلہ میں اس کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔

مطابق واقعہ نہیں کہ:

لان هٰؤلاء كانوا	اس لیے کہ یہ لوگ مکہ، طائف، مدینہ
يسكنون المدن مكة والطائف و	اور یمن کے شہروں میں رہتے تھے۔ تو یہ
المدينة واليمن فهم	دیہاتی عربوں کے مقابلے میں نرم اخلاق
الطف اخلاقاً من الاعراب	کے حامل تھے۔ اس لیے کہ دیہاتی
لما في طباع الاعراب من الجفاء[1]	عربوں کی طبیعتوں میں سختی اور درشتی ہوتی ہے۔

عرب کی بادیہ نشینی، بلاشبہ اپنی پرانی روایت میں جس کا اثر کسی نہ کسی حد تک آج بھی باقی ہے، مزاج کی سختی اور طبیعت کے کھردرے پن کی کمی رکھتی ہے۔ لیکن اس موقع پر آپؐ کی طرف سے مذکورہ قبائل کی نشاندہی کی وجہ صرف ان کی شہریت پسندی کا قرار دینا غالبًا بہت زیادہ مضبوط نہیں۔ اس کا سبب اگر محض شہر کی سکونت ہوتی تو اس کا دائرہ صرف قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے چار قبائل تک محدود نہ ہوتا۔ اس سے یہ بات اپنے آپ نکلتی ہے کہ اعلیٰ ظرفی اور بلند طبعی کی یہ خصوصیات دیہی آبادی کے کسی حصہ میں پائی جائیں تو ان کے کسی فرد سے مثالی مسلمان کا تحفہ قبول کرنا، کسی کم ظرف اور پست طبیعت شہری کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور قابل ترجیح ہوگا۔ اسلام کی اصل دلچسپی تہذیب و شائستگی اور اعلیٰ اخلاق و کردار سے ہے۔ شہر والے اگر اس سے محروم ہوں تو وہ پست اور اگر دیہات والے اس سے آراستہ ہو جائیں تو وہ یقیناً شہریوں سے اعلیٰ وارفع قرار پائیں گے۔ اسی طرح گاؤں والوں 'اهل القرىٰ' کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ:

اهل الكفور هم اهل	یہ لوگ کافر اور (دینی لحاظ سے) مُردوں میں
القبور[2]	شامل ہیں۔

اُس وقت یا عام حالات کے لحاظ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسے مطلق اور دائمی حکم تسلیم کرنا ضروری نہیں۔ جیسا کہ شعائر کفر کے اظہار میں شہر اور دیہات کے فرق کی بحث میں شمس الائمہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۸۳، محولہ صدر

[2] السرخسی م ۴۸۳ھ: شرح السیر الکبیر للامام محمد: ۱/۴۵، ۴۶م - دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد الہند الجنوبی، ۱۳۳۵ھ طبع اولیٰ۔

سرخسی م ۴۸۳ھ اس کی اسی توجیہ کے قائل ہیں اور مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی کی صورت میں وہ اس خصوص میں دیہات اور شہر کے درمیان کسی فرق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔[۱]

شفقتِ اولاد سے محرومی

تیسری بات حافظ ابن کثیرؒ نے صحیح مسلم کی مشہور روایت کے حوالہ سے کہی ہے[۲]۔ جس میں آپؐ کے یہاں بدوؤں کی ایک جماعت کی طرف سے چھوٹے بچوں کو بوسہ لینے پر تعجب کا اظہار کیا گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ بدوؤں کی ایک جماعت کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آنا ہوا۔ جہاں انھوں نے ایسا دیکھتے یا اس کا تذکرہ سنتے موجود لوگوں سے حد درجہ استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ آیا آپ لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی بوسہ لیتے ہیں۔ جس کا جواب مجمع نے اثبات میں دیا۔ اس پر ان کا فخریہ ردعمل تھا کہ ہم تو کبھی انھیں بوسہ نہیں لیتے۔ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

و املك ان كان الله نزع منكم الرحمة[۳]	میں کیا کرسکتا ہوں اگر اللہ نے تم سے محبت اور رحمت کو کھینچ نکالا ہے۔

۱؎ حوالہ سابق: ۱/ ۴۶ ۲؎ تفسیر ابن کثیر: ۳۸۳/۲

۳؎ صحیح مسلم جلد ۲۔ کتاب الفضائل، باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال وتواضعہ وفضل ذالک، عامرہ، مصر۔ یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔ جلد ۲ کتاب الادب، باب تقبیل الولد وتقبیلہ ومعانقتہ اصح المطابع دہلی۔ البتہ یہاں صحیح مسلم کی بدوؤں کی جماعت 'ناس من الاعراب' کے بجائے ایک بدو 'اعرابی' کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح آخری ٹکڑا اس طرح ہے: او املك لك اذ انزع الله من قلبك الرحمة۔ بخاری، محولہ بالا حافظ ابن کثیر کے لیے صحیح بخاری کے یہ الفاظ زیادہ صریح اور مفید مطلب تھے۔ یوں بھی اگر دوسرا مرجح نہ ہو تو صحیحین کی روایت میں بخاری کا حوالہ پہلے دینا چاہیے۔ جبکہ اس موقع پر ابن کثیر نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے۔ صحیحین کے کتاب اور باب کے اختلاف کی تفصیل اس کے علاوہ اپنے آپ میں حد درجہ قیمتی چیز ہے جس سے دونوں اماموں کے فہم حدیث کی واقفیت کے ساتھ طالب علم کے حدیث کے اپنے فہم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ عام طور پر یہ معاملہ بڑی سہل انگاری کا شکار ہے۔ اول تو حدیث کے حوالے اکثر و بیشتر ثانوی مآخذ سے دئے جاتے ہیں۔ اصل سے دینے کی صورت میں بھی بس حدیث جس کتاب سے بھی مل جائے غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ حوالوں میں انتخاب شاذونادر ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کے یہاں اس میں کوتاہی عام ہے۔

اس سے بھی بالواسطہ یہی استدلال ہے کہ دیہاتی پر شہری کو فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اوپر کے دوسرے دونوں نکات کی طرح یہاں بھی اس روایت سے اس عموم و اطلاق کے حق میں استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز عرب کی مخصوص معاشرت اور بالخصوص اس وقت کی دیہی عرب آبادی کی عام حالت اور کیفیت کے مدنظر تھی۔ جسے کسی مسلمہ اور قاعدہ کلیہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ روایت بالا کی روشنی میں بلاشبہ بدوی زندگی کی دوسری کمیوں اور خرابیوں کی طرح طبیعت اور مزاج کی یہ سختی بھی کوئی مستحسن چیز نہیں حدیث نبویؐ کا مقصود صرف اس کمی کا دور ہو جانا ہے۔ اس کے لیے دیہاتوں سے شہروں کی طرف مہاجرت کی تاکید نہیں نکلتی۔ تمدنی ترقی اور شہری سہولیات کی دیہاتوں تک فراہمی، اسی طرح تربیت و اصلاح کے مناسب مواقع کی دستیابی سے اہل دیہات کی مزاجی اور دینی خامیوں کو دور کر دیا جائے، تو ہر حال میں شریعت کا اصرار دیہات چھوڑ کر شہر کی لازمی رہائش کا نہیں ہے۔ شریعت اور تہذیب کے تقاضوں کی مناسب تکمیل ہو جائے تو شہر کی طرح دیہات میں بھی رہ کر آدمی اپنے رب کو خوش کرنے اور اس طرح دین و دنیا کی سعادتوں سے خود کو بہرہ مند کرنے کا سامان کر سکتا ہے۔

بڑے پیمانے کی نقلِ مکانی کی عدم مطلوبیت کے دوسرے دلائل

اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہے کہ دین کی پیروی اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقلی ضروری نہیں ہے۔ قرآن و سنت کے وہ نصوص جن سے اس کا اشارہ نکلتا اور بالواسطہ جن کا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، درحقیقت ان کا یہ منشا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقصاء سے کچھ دوسرے نکات سامنے آتے ہیں جن سے معمول کے طور پر بڑے پیمانے پر انسانی آبادی کی نقل مکانی کی عدم مطلوبیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

۱۔ نفسیاتی آزار

پہلی چیز نفسیاتی آزار ہے۔ وطن کی محبت انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ اپنی جائے پیدائش اور مالوف وطن کو اسے تنہا یا بیوی بچوں کے ساتھ چھوڑنا ہو، ہر حال میں یہ اس کے

لیے شاق اور شدید نفسیاتی آزار کا موجب ہے۔ وطن کی یہ جدائی سیاسی مجبوریوں کے تحت ہو یا تلاشِ معاش کی ضرورت سے ہو، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ہر حال میں یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے، جس سے اسے شدید ذہنی اذیت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسے فطرتِ سلیم کی علامت قرار دیا گیا ہے کہ آدمی کا دل اپنی جائے پیدائش کی طرف لگا رہے اور جس دھرتی پر اس کا سر گرا ہو، اس کی یاد اسے ہمیشہ ستاتی رہے[۱] بقراط حکیم کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ مریض کا صحیح علاج اس کی سرزمین کی جڑی بوٹیوں سے ہی ہو سکتا ہے اس لیے کہ طبیعت اپنی مالوف آب و ہوا سے مانوس اور اس کی غذا کے لیے بے چین رہتی ہے[۲] سمجھ دار انسان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے بھائی بندوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اپنے زمانہ کے لوگوں کی خاطر مدارات کا اہتمام کرے، ساتھ ہی اپنے وطن کے لیے اس کا دل ہمیشہ بے چین رہے[۳] دوسرے کہنے والے کا کہنا ہے کہ زیرک انسان اپنے وطن کے لیے ویسے ہی بے چین ہوتا ہے جیسے کہ اچھی نسل کا گھوڑا اپنے کھونٹے کے لیے بے چین ہوتا ہے[۴] یہاں تک کہا گیا ہے کہ جس طرح کہ دودھ پلانے والی عورت کا آدمی پر حق ہوتا ہے، ویسے ہی اس کے وطن مالوف کا اس کے اوپر حق ہوتا ہے[۵] یہ جو کچھ کہا گیا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ معلوم ہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم میں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بے دینی کے ان مجرموں کو جان سے مار ڈالیں[۶] اسی کے حوالہ سے دوسرے موقع پر نفاق زدہ مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا گیا۔

ولو انا کتبنا علیھم ان	اور اگر ہم ان کے اوپر یہ فرض کرتے کہ تم
اقتلوا انفسکم او اخرجوا	آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو یا یہ کہ

---

[۱] کبریت احمر محی الدین ابن عربی م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء: کتاب محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار فی الادبیات و النوادر الاخبار: ۲/۲۳۵ - ۲۳۶، مطبعۃ السعادۃ، مصر، طبعہ اولیٰ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔ اس موقع پر اس مضمون کے دوسرے اقوال و اشعار بھی ہیں جنھیں طوالت سے بچنے کے لیے قلم انداز کیا گیا ہے۔

[۲] بقرہ: ۵۴۔ روایات کے مطابق تطہیر کے اس عمل میں بنی اسرائیل کے قریب ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ تفسیر الجلالین ۱/۱۲۔ دار المعرفۃ، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، طبعہ اولیٰ۔

من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل	اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو بہت تھوڑے
منھم (نساء: ۶۶)	لوگوں کو چھوڑ کر وہ یہ کام نہ کرپاتے۔

دیکھنے کی بات ہے کہ اس موقع پر جان سے مارے جاتے اور گھر سے نکلنے کو برابر کی تکلیف کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے[1] اسی طرح حضرت طالوتؑ کے واقعہ میں اپنے گھر بار سے نکالے جانے کو بنی اسرائیل کے لیے جنگ کا جائز محرک قرار دیا گیا ہے۔

قالوا ومالنآ الاّ نقاتل	انھوں نے کہا: اور ہمیں کیا ہو گیا ہے
فی سبیل اللہ وقد اخرجنا	جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ کریں جبکہ ہمیں
من دیارنا وابناءنا ط	اپنے گھر بار سے نکالا گیا اور اپنے بال بچوں
(البقرہ: ۲۴۶)[2]	سے جدا کر دیا گیا۔

اس سے بھی وطن مالوف کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس سے محرومی کی صورت میں جنگ کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے وطن سے تعلق اور محبت کا یہی نمونہ سامنے آتا ہے۔ ہجرت کے موقع پر سرزمین مکہ کو خیرباد کہتے ہوئے اسے مخاطب کرکے آپؐ نے انتہائی کرب کے ساتھ فرمایا تھا:

ما اطیبك من بلد واحبك	تو کس قدر پاکیزہ اور میرے لیے کس قدر
الیّ ولولا ان قومی اخرجونی	محبوب ہے، اگر میری قوم کے لوگ مجھ کو
منك ما سکنت	تجھ سے نہ نکالتے تو تیرے سوا میں کہیں
غیرك[3]	اور سکونت پذیر نہ ہوتا۔

روایت کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں۔

---

[1] محاضرۃ الابرار: ۲/ ۲۳۵۔ محولہ بالا۔ ابن عربیؒ نے اس موقع پر صرف اسی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن یہی مضمون سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ: ۸۵، کا بھی ہے جس میں یہود کے جرائم میں اسے شمار کیا ہے کہ وہ گناہ اور سرکشی کی راہ اپنا کر اپنے ہی کچھ لوگوں کو قتل کرتے اور انھیں گھر سے بے گھر کرتے ہیں: ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم وتخرجون فریقا منکم من دیارھم تظٰھرون علیھم بالاثم والعدوان ط۔ یہاں بھی گھر سے نکالے جانے کو جان مارنے کی اذیت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ ممتحنہ کی آیات ۸، ۹ سے بھی یہی مضمون ثابت ہوتا ہے۔ [2] محاضرۃ الابرار، حوالہ سابق۔ [3] جامع ترمذی جلد۲۔ ابواب المناقب، باب فضل مکہ۔ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ قال الترمذی ہٰذا حدیث حسن صحیح غریب من ہٰذا الوجہ۔ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

واللہ انك لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولولا انی اخرجت منك ما خرجت [1]	بخدا تو اللہ کی سب سے بہتر سرزمین اور اللہ کے نزدیک سب میں بڑھ کر محبوب سرزمین ہے۔ اگر مجھ کو تجھ سے نکالا نہ گیا ہوتا تو میں (کبھی) نہ نکلتا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کے صدر اول میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی اور لوگوں نے اپنے مالوف وطن کو خیرباد کہہ کر نئے وطن آباد کیے۔ حضرات صحابہ کرامؓ پھیلے ہوئے عالم اسلام میں اس طرح پھیلے جیسے کہ فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ بعد کی خیر القرون میں حضرات تابعین اور تبع تابعین کرام کا معاملہ اس سے مختلف نہیں رہا۔ بعد کے زمانہ میں حضرات فقہا، ومحدثین کی طرف سے بھی یہ روایت اسی طرح جاری اور قائم رہی۔ جس کا سلسلہ آج تک بدستور کم وبیش اسی طرح قائم ہے۔ لیکن یہ تمام منتقلیاں کسی بڑے مقصد اور ضرورت کے تحت ہوئیں اور بڑے دینی فائدے کے لیے چھوٹے نفسیاتی آزار کو گوارا کیا گیا اس طرح کی ضرورت اور مصلحت آج بھی جہاں پائی جائے یہ ایسے ہی مطلوب اور مستحسن رہے گا اور اسے گوارا کرنے میں کوئی حرج نہیں رہے گا۔ آج کے حالات میں اصل سوال دیہات کے غریب اور بے سہارا شخص کی شہروں کی طرف اضطراری منتقلی کا ہے جو محض اپنے پیٹ کی آگ بجھانے اور اپنی اور اپنے اہل خاندان کی ناگزیر ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہنے کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ تنہا اور بعض اوقات بال بچوں کے ساتھ وطن کو چھوڑ کر اپنی قسمت کو پردیس کے حوالہ کر دیتا ہے۔

اس نکتے کی روشنی میں اس طرح کی آبادی کو اس نفسیاتی آزار سے بچانا ضروری ہے اور کتاب وسنت اور عقل عام کا یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ بڑے مقاصد کے تحت مناسب سہولیات کے ساتھ دیہاتوں سے اٹھ کر شہروں میں جگہ بنالیں، ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں اس طرح کی کوئی کشش اور مصلحت نہ ہو اس کی آبادی کو اپنے وطن مالوف اور اس کے محور سے بندھے رہنا ہی مطابق دین اور قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے[2]۔

---

[1] ترمذی، حوالہ سابق۔ روایت حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراء۔ قال الترمذی ہٰذا حدیث حسن غریب۔

[2] ایک تازہ جائزہ کے مطابق غیر ملکوں میں مقیم ہندوستانی وہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلے میں ذیابیطس کے مرض کے زیادہ شکار رہتے ہیں۔ جبکہ پوری دنیا کے دس کروڑ مریضوں میں دو کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانی ہیں اور

والدین کی خدمت

دوسرا نکتہ والدین کی خدمت کا ہے جو اس طرح کی منتقلی اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف آج کے بڑھتے رجحان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اسلام نے اپنے معاشرتی نظام کی جو تفصیل پیش کی ہے، والدین کی خدمت کو اس میں 'ذروۂ سنام' کی حیثیت حاصل ہے۔ اس خدمت کا حق اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے جبکہ اولاد ماں باپ کے ساتھ یا ان کے پاس رہے۔ قرآن میں ایک موقع پر اس کی صراحت بھی ہے۔

امّا یبلغنّ عندك الكبر	اگر ایسا ہو کہ تمہارے پاس رہتے ان
احدهما او كلاهما فلا	میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کی
تقل لهما اف وّلا تنهرهما	عمر کو پہنچیں تو تم انھیں اف تک نہ کہو، نہ
وقل لّهما قولا كريما ۝ (بنی اسرائیل: ۲۳)	انھیں جھڑکو بلکہ ان سے شریفانہ بات کرو۔

دوسرے موقع پر بھی اولاد کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ حاضر باش ہو:

وبنین شهود ا ۝ (مدثر: ۱۳)	اور حاضر باش بیٹے۔

والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی دیگر آیات و احادیث[1] کا اپنے آپ مقتضا ہے جو بالکل واضح ہے۔ اس موجودگی اور حاضر باشی کی فطری اور آسان صورت یہی ہے کہ عمومی طور پر ہر شخص کو اپنے مانوس وطن میں بسے رہنے کی صلاحیت ہو۔ تلاش معاش میں وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر گھر سے بے گھر ہونے کے لیے مجبور نہ ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ والدین کے ساتھ اولاد کی یہ موجودگی اور حاضر باشی اُس صورت میں بھی حاصل ہو جاتی ہے جبکہ وہ ان کو لے کر شہر میں منتقل ہو جائے اور ذاتی / کرائے کے مکان میں مستقل طور پر وہیں سکونت پذیر ہو جائے۔ لیکن بوجوہ یہ چیز دشواریوں کی حامل ہے۔ والدین کی خدمت کا حق ادا کرتے ہوئے شہر میں باوقار اور باعزت زندگی گزارنے کا سامان کر سکنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ خاص خاص لوگ ہی اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

= اس کے کل مریضوں میں ایشیائی ممالک کے مریضوں کی تعداد پچاس فی صد ہے۔ روزنامہ قومی آواز نئی دہلی ۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ء۔ خبر بعنوان: ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ پر ہندوستانی ڈاکٹر کو تشویش۔

[1] ان آیات و احادیث کی تفصیل کے لیے ہماری کتاب 'مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام' ص ۸۹، ۹۰، ادارۂ تحقیق، علی گڑھ طبع دوم ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء

جبکہ ماں باپ کی خدمت ہر خاص و عام کا یکساں وظیفہ ہے اور عالم اور جاہل ہر ایک کو اس کا یکساں حق ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید، دیہات میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار چکے ماں باپ کے لیے بسا اوقات شہر کے چھوٹے اور تنگ مکان میں رکھنا خود ان کی نفسیاتی ایذا رسانی کا باعث ہے۔

فطری اور سہج انداز میں والدین کی خدمت کا یہ حق دیہات سے شہر کی طرف عدم منتقلی کی صورت میں ہی ادا ہو سکتا ہے۔ اسی صورت میں ذہنی اذیت سے دوچار کیے بغیر ماں، باپ کی خدمت اور بڑھاپے کے آخری ایام میں ان کی دیکھ ریکھ کا حق ادا ہو سکتا ہے اور اسی سے دین کی نظر میں بڑے پیمانے کی دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقلی کی عدم مطلوبیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔[1]

رشتہ داروں سے دوری

اس کے ساتھ ہی اسلام اپنی معاشرت کا جو خاکہ ہمیں عطا کرتا ہے، اس میں آج کے دیہات سے شہر کی طرف منتقلی کے عمومی رجحان کے پس منظر میں کٹی ہوئی پتنگ کی مانند رہنے کے بجائے رشتہ داروں کے پھیلے ہوئے دائرے کے ساتھ رہنے کا تصور ابھرتا ہے۔ صرف ایک آیت کریمہ کے حوالہ سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے جس میں ان رشتہ داروں کی تفصیل ہے جن کے گھروں سے ان کی رضامندی کے اطمینان سے ان کے غائبانہ میں بھی آدمی بے تکلف کھا سکتا ہے۔[2]

..... وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ	.....اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی
أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ	سختی ہے کہ تم کھاؤ اپنے (اور اپنی اولاد)
أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ	کے گھروں سے، یا اپنے باپوں کے گھروں
أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ	سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے
أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ	بھائیوں کے گھروں یا اپنی بہنوں کے گھروں

---

[1] اس طرح کی مہاجرت کے مزید نقصانات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا دوسرا رسالہ 'پردیس کی زندگی اور اسلام'، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ دسمبر ۱۹۹۰ء بار اول

[2] تفسیر الجلالین ۲/۶۹، محولہ بالا

أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ	سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا
عَمّٰتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ	اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے
أَوْ بُيُوتِ خٰلٰتِكُمْ أَوْ مَا	ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں
مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ أَوْ	کے گھروں سے یا ان گھروں سے جن کی
صَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ	کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست
جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا	کے گھر سے، تمہارے لیے کوئی حرج نہیں
أَوْ أَشْتَاتًا (نور: ۶۱)	ہے کہ تم ایک ساتھ کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ۔

اپنے گھر میں اپنی بیوی اور اولاد کا گھر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی ماموں اور خالہ کے گھروں سے بے تکلف کھانے کی جو اجازت ہے، آج کے حالات میں اس کا فائدہ مختلف آبادیوں کے اپنے اپنے مراکز میں ٹکے رہنے کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ رشتہ داروں کے جھرمٹ کی اس بے تکلف معاشرت کا لطف آدمی اسی وقت اٹھا سکتا ہے جبکہ ہندوستان جیسے ملکوں کی بالخصوص دیہاتی آبادی اپنے اپنے مقامات پر جوں کی توں بنی رہے۔ بلکہ اس آیت کریمہ سے تو ایک طرح سے شہروں سے شہروں کی طرف آج کے معمول کی مہاجرت کی بھی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ آدمی اپنے پشتینی شہر کو چھوڑ کر نئے شہر میں ایک دو رشتہ دار تو پیدا کر سکتا ہے لیکن رشتہ داریوں کے اس سلسلے کی نعمت اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جس کا اوپر کی آیت کریمہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے ایک طرح سے آج کے سسرالی جھکاؤ کی ذہنیت کی بھی سرزنش ہوتی ہے۔ آیت بالا میں بے تکلفی کے رشتہ داروں کے اس پورے سلسلے سے سسرالی رشتہ داروں کو باہر رکھا گیا ہے۔ جس سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنے موروثی اور آبائی وطن کو چھوڑ کر سسرال کو پکڑ اس کے رشتہ داروں کے سلسلے سے اس کمی کی تلافی کا اطمینان کر سکے۔ دیہات سے اٹھ کر آدمی اپنی سسرال کسی شہر اور کسی بھی قصبہ میں بنا سکتا ہے اور اس طرح اپنے لیے رشتہ داروں کا ایک دائرہ پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ان خونی اور رحمی رشتہ داروں کے ساتھ اور ان کے آس پاس اس کو زندگی گزارنے کی سہولت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اپنی جائے پیدائش اور وطن اصلی ہی کو وہ اپنا مرکز بنائے۔ بلاشبہ روایتی شہریوں کے لیے رشتہ داریوں کے یہ دونوں سلسلے اپنے

ہی شہر میں حاصل ہو سکتے ہیں جس کے ذریعہ وہ دنیا کے لطف کے ساتھ مطلوبہ دینی معاشرت کے تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں لیکن پشتینی دیہی آبادی کے لوگ اگر اپنا وطن چھوڑ کر شہروں کی مہاجرت کا قصد کریں تو سسرال تو وہ وہاں کسی طرح سے پیدا کر سکتے ہیں، خونی اور رحمی رشتہ داروں کی صحبت و معیت کا ان کے لیے کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ دین کے اس مطلوب پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ عام طور پر آبادی کی مختلف اکائیاں اپنی اپنی جگہوں پر ٹک کر رہیں اور شہر زندگی کے بنجارہ بننے کے بجائے وہ اپنے آبائی وطن کو ہی اپنا مستقل مرکز اور محور بنا کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں۔

اس کے علاوہ کتاب و سنت میں صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی جو فضیلت بیان کی گئی اور اس کی جو تاکید کی گئی ہے[1] اس کا حق معاشرت کے اس نقشہ کی پیروی کے ساتھ ہی ادا کیا جا سکتا ہے جس میں غیر منظم اور اللٹپ شہریت پسندی کے بجائے اپنی جائے پیدائش اور وطن اصلی میں قیام و استقرار کو ترجیح حاصل ہو۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی یہ بات بار بار سامنے آئی، وطن مالوف کو چھوڑ کر کسی اور جگہ کی سکونت اختیار کرنا، اسلام میں کوئی ممنوع و محذور (Taboo) نہیں۔ صدر اول کے عمل کی تائید اس کے حق میں ہے۔ لیکن اسی نمونے کے حوالہ سے کوئی بڑا مقصد اور بڑی مصلحت ہو جس کے حصول کے لیے بڑے نفع کے حصول کے لیے چھوٹے ضرر کے انگیز کرنے کے اصول پر اصل وطن کو چھوڑ کر نیا وطن یا آج کے حالات میں دوسرے لفظوں میں دیہات کو چھوڑ کر شہر کی طرف کوچ کے طریقے کو اختیار کیا جائے۔ صرف پیٹ کی آگ بجھانے اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے مقصد سے دیہاتوں سے شہروں کی طرف مہاجرت دین کے نقطۂ نظر سے کوئی محبوب و پسندیدہ نہیں۔ اصولی طور پر دور حاضر کے معزز شہری کی یہ ضرورت اس کے وطن اصلی میں ہی پوری ہونی چاہیے۔ جبکہ دیہات کے حالات کو سازگار بنا کر یہ ضرورت بہولت پوری کی جا سکتی ہے تو خواہ مخواہ کے لیے آدمی کو گھر سے بے گھر اور دیسی سے پردیسی بنانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اعزہ و اقرباء سے دوری اور ان کے ساتھ اور ان کے پاس

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے ہماری کتاب 'مومنانہ زندگی کے اوصاف' میں مضمون 'صلہ رحمی' ص ۱۱۵ تا ۱۲۷، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی بار اول ۱۹۸۹ء۔

کی پرلطف و پرکشش معاشرت سے دوری اس کا دوسرا بڑا نقصان ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر سے دیہاتوں سے شہروں کی طرف عمومی مہاجرت کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرتا اور اسے ناپسندیدہ اور غیر مطلوب قرار دیتا ہے۔

ماحولیات، بیماری اور غربت وغیرہ کے مسائل

بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں کے پس منظر میں شہریت پسندی کے اس رجحان کے نتیجے میں ماحولیات، بیماری اور غربت وغیرہ کے وہ دوسرے مسائل ہیں جن کے پیش نظر مصالح کی محافظ اور مفاسد کی دشمن، اسلامی شریعت اس رجحان کی حوصلہ شکنی کرتی اور اسے غیر پسندیدہ قرار دیتی ہے۔ اسلام اپنی اولین تاریخ کے آئینے میں شہروں کا دین رہا ہے[1]۔ اس لیے فطری طور پر آج کے شہریت پسندی کے رجحان سے اسے کوئی وحشت اور اجنبیت نہیں ہے۔ لیکن اس شہریت پسندی کے نتیجے میں اگر یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہوں تو اس کا خواہ مخواہ کے لیے یہ اصرار بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ اللٹپ طور پر دیہی آبادی شہروں کی طرف مہاجرت کرے اور غیر منصوبہ بند، شہری سہولیات سے محروم بے قابو شہری آبادی اپنے ساتھ پرانے شہریوں کا بھی ان میں جینا دوبھر کر دے۔ چنانچہ آبادی بحران کمیٹی کے ایک مطالعہ کے مطابق اتر پردیش کا شہر کانپور دنیا کے ان پانچ سب سے بڑے شہروں میں سے ایک ہے جہاں سہولیات زندگی بدترین ہیں۔ گندگی اور فضائی آلودگی کی اپنی روایتی خرابیوں کے علاوہ دنیا کے ۴۵ ملکوں کے ۱۰۰ شہروں کے اس جائزے میں شیر خوار بچوں

---

[1] خیال رہے کہ ۶۵۰ء تا ۱۲۵۸ء کے درمیان کے عالم اسلام کے ازدہار اور اس کے دور شباب میں اسلامی دنیا میں دو درجن سے زائد ایسے شہر تھے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ بصرہ، کوفہ اور اشبیلیہ کی آبادی پانچ پانچ لاکھ، قاہرہ کی دس لاکھ، قرطبہ کی پندرہ لاکھ اور بغداد کی آبادی تیس لاکھ تھی، جبکہ اس وقت پورے یورپ میں سوائے قسطنطنیہ کے ایک شہر بھی ایسا نہیں تھا جس کی آبادی ایک لاکھ ہو۔ روم اور فلورنس سب سے بڑے شہر تھے جن کی آبادی بہ ترتیب پچاس ہزار اور پینتالیس ہزار تھی۔ لندن کی پچیس ہزار تھی۔ دریں حالیکہ بارہویں صدی عیسوی میں پورے انگلستان کی آبادی بائیس لاکھ تھی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ ۱/۳۸۱ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ طبع دوم نومبر ۱۹۹۴ء

کی شرح اموات میں یہ شہر سب سے آگے ہے[1] واشنگٹن کے ایک مطالعہ کے مطابق ہندوستان میں روز افزوں شہری آبادی میں اضافہ سے جہاں اس کے تمام شہر ناقابلِ رہائش ہو رہے ہیں، ان کو درپیش چیلنجوں میں سب سے بڑا مسئلہ شہری افلاس کا ہے جس کا ۶۸ فی صد شکار خواتین اور بچے ہیں۔ بڑھتے جرائم اس کا دوسرا شاخسانہ ہیں۔ چنانچہ ملک کی راجدھانی دہلی میں جرائم کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے[2] فضائی آلودگی اس شہر کا دوسرا بڑا امتیاز ہے، جس میں ملک کے پانچوں بڑے میٹروپولیٹن شہروں میں یہ سب سے آگے ہے[3] شہریت پسندی کے اس رجحان کے نتیجے میں ذہنی اور نفسیاتی مسائل اس کے علاوہ ہیں۔ چنانچہ چھوٹی جگہ میں بہت سے لوگوں کی موجودگی سے نہ صرف جسمانی تھکن بلکہ اس سے سوچنے سمجھنے کی قوت بھی متاثر ہوتی ہے یہی وجہ ہے جو مشرقی دہلی کی گنجان آبادی کا بچہ اسکول میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے افراد کنبہ کے درمیان گھروں میں بے سکونی پیدا ہوتی اور اسکول میں بچوں کی پڑھائی پر اثر پڑتا ہے۔ مزید براں گنجان آبادی میں رہنے سے نہ صرف ذہن پر دباؤ پڑتا ہے جس سے ذاتی اور آپسی تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ سماجی سطح پر بھی اس کے ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے پڑوسیوں کے تئیں بھی بجائے مثبت کے منفی رجحانات پیدا ہوتے ہیں[4]

اس خصوص میں جو حال ہمارے ملک ہندوستان کا ہے، دنیا کے دوسرے ملکوں کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہے جس کی ایک مثال مصر کی راجدھانی قاہرہ ہے۔ چنانچہ دوسرے بڑے شہروں کی طرح قاہرہ بھی ٹریفک جام، فضائی آلودگی، کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور و غل اور بے ہنگم بڑھتی ہوئی آبادی اور اس سے پیدا ہونے والے

---

[1] قومی آواز، نئی دہلی ۲۱ نومبر ۱۹۹۱ء۔ جائزہ زیرِ عنوان: شہری آبادی میں اضافہ کی شرح انتہائی افسوس ناک۔

[2] قومی آواز، نئی دہلی، یکم دسمبر ۱۹۹۰ء، رپورٹ بہ عنوان: گنجان آبادی کے باعث ملک کے تمام شہر ناقابل رہائش۔

[3] دی ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی (انگریزی) ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء خبر بعنوان۔ دہلی تمام میٹروپولیٹن شہروں میں سب سے زیادہ فضائی آلودگی کا شکار۔ Delhi Most Polluted Metro

[4] قومی آواز، نئی دہلی ۲۴ دسمبر ۱۹۹۲ء، تجزیہ بعنوان: گنجان آبادی ہیجانی کیفیت و ذہنی تکان کی ذمہ دار۔

مسائل کا شکار ہے۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ آبادی والا یہ شہر پچھلے تیس سال سے آکر آباد ہونے والے افراد کے سیلاب سے گھرا ہوا ہے۔ یہ دیہاتی جو اپنا وطن چھوڑ کر دولت مند بننے کے لیے روزگار کی تلاش میں قاہرہ آتے ہیں، معمولی کاروبار پر زندگی بسر کرتے ہیں جو بسا اوقات ناجائز کاروبار میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔[۱]

ظاہر ہے شہری آبادی کی یہ صورتِ حال، کم از کم اسلام کے لیے، جو ہر ہر قدم پر انسان کے فائدے اور اس کی دنیا و آخرت کی بھلائی کے لیے فکر مند ہو،[۲] کوئی خوش آئند چیز نہیں ہو سکتی ہے۔ شہری زندگی کسی نص شرعی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہر حال میں انسان اسی کے اندر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہو۔ حالات جیسے کچھ ناہموار اور صورت احوال نامساعد اور غیر موافق ہو لیکن ہر حال میں شہر میں رہنا ہی ضروری ہو۔ پچھلی گفتگو کی روشنی میں نصوص قرآن و سنت سے اس کے حق میں استدلال کرنا بہت مشکل ہے۔ تہذیب و تمدن، ذہنی ارتقاء اور وسائل حیات کی فراوانی کے باعث دیہات پر شہر کی برتری مسلم ہے اور دیہات جتنی کچھ ترقی کر لیں کسی نہ کسی درجے میں یہ برتری اور تفوق شہروں کو دیہاتوں پر بہر صورت حاصل رہے گا۔ لیکن ان فوائد کے مقابلے میں، فضائی آلودگی، جرائم، غربت و افلاس اور نفسیاتی مسائل کا اگر انسان کو لازمی تحفہ ملے تو یقیناً یہ اس کی سوچ کا موضوع ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کرے۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام اور حاصل کلام کے طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ترجیحات بالا سے دیہات کے

---

[۱] قومی آواز، نئی دہلی ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء، خبر بعنوان: قاہرہ شہر کی آبادی میں بے ہنگم اضافہ۔

[۲] اسلامی شریعت کی یہی اساس ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: الشریعۃ..... مبناھا علی تحری ماھو للہ اطوع وللعبد انفع، وھو الاصلح فی الدنیا والآخرۃ، فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴/۱۰۷ طبع جدید سعودی عرب۔ شریعت کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ ایک ایک کرکے اس چیز کی تلاش کرے جس سے کہ زیادہ سے زیادہ بندگی رب کا حق ادا ہو سکے اور بندگان خدا کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ نفع بخش ہو، دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا و آخرت ہر ایک کے لحاظ سے وہ اس کے لیے بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر ہو۔

مقابلے شہری زندگی کی ہر طرح کی بہتری اور برتری کے باوجود، دین کے نقطۂ نظر سے، آنکھ بند کرکے موجودہ شہریت کی رو میں بہہ جانا مناسب نہیں۔ تفصیلات بالا کی روشنی میں دین و دنیا کے بہت سے مصالح کے حصول اور ان کا تحفظ اگر اپنے موروثی اور آبائی مستقر میں رہ کر ہی حاصل ہوسکتا ہو تو یہ پہلو بھی کم قابل لحاظ نہیں۔ اس لیے ملکی حکومتوں کے ایجنڈے میں اگر دیہاتوں کو سہولیات سے آراستہ کرنے اور ان میں شہری سہولیات کی فراہمی کرنے کی بات شامل ہو تو دین پسندوں اور اسلام کے کلمہ گویوں کو بھی اس مہم میں ایسی ہی دلچسپی اور حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ والدین کی خدمت، اعزہ کے ساتھ حسن سلوک اور نفسیاتی سکون وغیرہ کی بہت سی دینی مصلحتیں ہیں جو انھیں اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہیں جبکہ دیہاتوں سے شہروں کی طرف مہاجرت کرنے کے بجائے وہ اپنے آبائی وطن ہی میں جم کر رہنے کو ترجیح دیں۔ اس مرکز کو چھوڑنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں اپنے خاندان کو غیر یقینی مستقبل کے حوالہ کرنا ہے۔ کسی شہر میں سر چھپانے کے لیے باپ اپنے لیے کوئی جائے پناہ بنا بھی لے تو اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کا مسئلہ پوری شدت سے برقرار رہتا ہے۔ جبکہ اپنے آبائی مستقر میں دیگر کمیوں کے ازالہ کے ساتھ اگر رک سکنے کا امکان پیدا ہو سکے تو یہ مسئلہ بہت آسانی اور فطری انداز میں حل ہوسکتا ہے۔

اس بے لگام مہاجرت نے تمام بڑے شہروں میں جھگی جھونپڑیوں کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا ہے جو دوسرے لفظوں میں جرائم کے مراکز ہیں۔ گندے ماحول، گندی فضا اور تنگ و تاریک رہائش کے ساتھ ان جھگی جھونپڑیوں میں معاشرت کی جو ناہمواری ہے۔ وہ اپنے آپ میں جرائم کو پروان چڑھانے کا کارخانہ ہے۔ جھگی جھونپڑیوں کی بستی بمبئی کی 'دھاراوی' تو ایشیاء کی سب سے بڑی سلم کالونی ہے ہی، اس عروس البلاد کی زائد از ایک کروڑ کل آبادی کا قریب نصف چالیس لاکھ جھگی جھونپڑی بستیوں میں رہتا ہے[1]۔ دہلی جیسے دوسرے بڑے شہروں کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ جرائم کے عبرتناک واقعات کی خبریں جو ان

---

[1] ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس نئی دہلی ۲ مئی ۹۵ء زیر عنوان: स्कूली बच्चों के लिये आहार योजना

[2] خیال رہے کہ ہندوستان میں شہریت پسندی میں مہاراشٹر سب سے آگے، جبکہ سب سے کم شہریت پسندی ہماچل پردیش میں ہے۔ نوبھارت ٹائمس نئی دہلی ۱۲ مئی ۹۳ء خبر بعنوان: महाराष्ट्र में सबसे ज्यादा शहरी करण

شہروں کے حوالے سے اخبارات میں چھپتی ہیں، اکثر و بیشتر ان کا تعلق انہی جھگی جھونپڑی کی آبادیوں سے ہوتا ہے۔ ان کی رہائش ہی ایسی ہے کہ آدمی جرائم پسند نہ بھی ہو تو وہ بگڑے ماحول کے نتیجے میں جرائم پیشہ ہو جائے۔ جرائم کے ان مراکز میں اگر کوئی خاندان باعزت اور باوقار اور شریف اور پاکباز رہ جائے تو اس کو بالکل استثناء سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس سے آگے درحقیقت یہ ایک معجزہ ہوگا اور معلوم ہے کہ معجزات کا ظہور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور ان کی بنیاد پر کبھی کوئی عام رائے قائم کی جاتی، نہ کسی عام نظریے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اس الل ٹپ مہاجرت کے نتیجے میں آبادیوں کا جو تناسب بگڑتا ہے، اور کسی شہر میں اجنبی آبادی کے ایک خاص حد سے آگے بڑھ جانے کے نتیجے میں مقامی آبادی سے اس کی رقابت اور کشمکش کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے[1]، وہ اس شہریت پسندی کی نامطلوبیت کا دوسرا پہلو ہے جو بعض اوقات بوجوہ دوسرے پہلوؤں سے زیادہ توجہ کا طالب اور قابل لحاظ ہے۔

آخری گزارش یہ کہ ناگزیر شہریت پسندی میں اس کا لحاظ بھی مناسب ہے کہ ایک شہر کی آبادی ایک خاص حد اور خاص دائرے سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ جیسے ہی وہ اس حد کو چھوئے نیا شہر بسانے کا اہتمام کیا جائے۔ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاکید کی تھی کہ مدینہ کی آبادی جب ایک خاص مقام تک پہنچ جائے تو تم اس کو چھوڑ کر شام چلے جانا[2]، اس کا ایک اشارہ یہ بھی نکلتا ہے۔ شہریت پسندی کے ان مسائل کے پس منظر میں جن کی تفصیل اوپر گزری آج کے دور میں آپؐ کے اس ارشاد مبارک کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے جس میں بڑے شہر انسان اور انسانیت دونوں کے لیے ایک مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔

---

[1] غیریت اور رقابت کی اس آگ میں پاکستان کا شہر کراچی تو جل ہی رہا ہے، ہندوستان کے بمبئی جیسے شہروں میں بھی اس کی علامات اب صاف دکھنے لگی ہیں۔ فراست ایمانی کا تقاضا ہے کہ اس برے دن سے اپنے آپ کو بچایا جائے اور غیر ضروری شہریت پسندی مسائل کا پیش خیمہ نہ بننے پائے۔ [2] السمہودی م ۱۰۵۶ھ: وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ۱/۸۲، مطبعۃ الآداب، مصر ۱۳۲۶ھ۔ اس میں یہ مقام سلع ہے۔ ساتھ ہی حضرت ابوذرؓ کی طرف سے اس ارشاد نبویؐ کی تکمیل یعنی کہ جب یہ آبادی سلع کے مقام تک پہنچ گئی تو میں شام میں فروکش ہو گیا۔ ابویعلیٰ کے حوالے سے یہ پوری روایت اس طرح ہے: عن زید بن وھب قال حدثنی ابوذر رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اذا بلغ البناء ای بالمدینۃ سلعا فارتحل الی الشام) فلما بلغ البناء سلعا قدمت الشام، سمہودی، حوالہ سابق۔ غالباً یہی روایت ہے جسے مسولینی سے اپنی مشہور ملاقات میں علامہ اقبالؒ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔" تفصیل کے لیے ماہنامہ افکار ملی دہلی جولائی ۱۹۹۳ء زیر عنوان: 'اقبال اور مسولینی'۔